توشی ہیکو ازتسو

اچھے اور برے کے لیے قرآنی الفاظ

(ترجمہ محمد خالد مسعود)

۱

دنیوی زندگی کا قنوطی تصور

قدیم عرب میں اخلاقی افکار کے ارتقاء کی تاریخ میں غالباً سب سے امتیازی بات یہ ہے کہ اسلام نے مطلق مشیت الٰہی کی بنیاد پر ایک نئی اخلاقیات کا اعلان کیا جبکہ قبل از اسلام اخلاقی زندگی کا رہنما اصول قبائلی روایت تھی جسے قرآن کریم میں سنت آباء کہا گیا ہے۔

اس بات کو غلط نہ سمجھا جائے۔ یہ کہنا کہ قبل از اسلام عربوں کے ہاں اچھے برے کی پہچان یا نیک و بد میں کوئی تمیز نہیں تھی' ان کے ساتھ صریح ناانصافی ہو گی۔ اس کے برعکس اگر ہم مشہور ''کتاب الاغانی'' جیسی دستاویز کا بغور مطالعہ کریں تو اس سے فوراً یہ بات سامنے آتی ہے کہ زمانہ جاہلیت کے عرب در حقیقت ایک بہت ہی شدید اخلاقی حس کے مالک تھے۔ ان ''نام نہاد آزاد فرزندان صحرا'' کے پاس ایک دوسرے کے ساتھ برتاؤ کے تفصیلی قوانین موجود تھے' جن کی رو سے وہ ہر ذاتی اور قبائلی عمل کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ کرتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے ہاں اچھے برے یا نیک و بد کا کوئی اصولی یا باقاعدہ نظام نہیں تھا۔ ان کے نیک و بد کے معیار کی بنیاد محض منطقی تکرار پر مبنی یہ مساوات تھی کہ ایک کام اس لیے اچھا ہے کہ وہ اچھا ہے۔ علاوہ ازیں ان اخلاقی خصائص کی بنیاد پر حقیقی بحران کے وقت کسی فرد کے ذاتی افعال کو قابو میں رکھنا ممکن نہیں تھا۔ خصوصاً اس صورت میں جہاں قبیلہ کے مفادات کو

خطرہ ہو۔ مثلاً صحرا کا معروف اصول تھا کہ اپنے بھائی (ہم قبیلہ) کی ہر صورت میں مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

جاہلی عرب کا اگر کوئی استدلال تھا تو صرف یہ کہ ایک چیز اچھی یا جائز اس لیے ہے کہ ہمارے آباء و اجداد ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔

"واذا قیل لهم اتبعوا ما انزل الله قالوا بل نتبع ما الفینا علیه آباؤنا اولو کان آباؤهم لایعقلون شیئا ولایهتدون" (البقره : ۱۷)

جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جو اللہ نے نازل فرمایا ہے' اس کی پیروی کرو' تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا۔ بھلا اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ نہ سمجھتے ہوں اور سیدھے راستے پر نہ ہوں تب بھی؟

"بل قالوا انا وجدنا آباءنا علی امه وانا علی اثرهم مهتدون' وکذلک ارسلنا من قبلک فی قریه من نذیر الاقال مترفوها انا وجدنا آباءنا علی امه وانا علی اثرهم مقتدون. قل او جئتکم باهدی مما وجدتم علیه آباؤکم قالوا انا بما ارسلتم به کفرون" (الزخرف : ۲۲-۲٤)

بلکہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک راہ پر پایا ہے اور ہم قدم بہ قدم ان ہی کے پیچھے چلتے ہیں۔ پیغمبر نے کہا خواہ تمہارے پاس ایسی چیز لاؤں کہ وہ تمہارے باپ دادا کے راستے سے زیادہ سیدھا ہو' تب بھی؟ وہ کہنے لگے تم جو کچھ دے کر بھیجے گئے ہو' ہم اسے نہیں مانتے۔

فطری طور پر اس قسم کے طرز استدلال کی منفی جانب یہ ہے کہ ان کے نزدیک ہر وہ چیز بری ہے جو موجودہ سماجی نظام میں کوئی رخنہ ڈالے یا جو قبائلی آباء و اجداد کے موروثی عرف

اور رواج کو کسی قسم کا نقصان پہنچاتی ہو یا اس کے احترام کو کمزور کرتی ہو۔ اسلام نے اخلاقی اصلاح کا جو نظام دیا اس کا کام بعینہ یہی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اخلاق کے جو اصول اتنی محنت اور جدوجہد سے قائم کیے ان کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے روشن عقیدہ پر تھی جس کے نزدیک قبائل کے رسوم و رواج کی حیثیت معمولی دنیوی معاملات سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ ان میں کوئی چیز مقدس نہیں تھی۔ فطری طور پر اسلام کے لیے زمانہ جاہلیت کے عربوں کے اخلاقی افکار کے بنیادی اصول سے مکمل طور پر ناطہ توڑنا لازمی تھا۔

حمیت جاہلیت کی روح کے خصوصی مظاہر میں سے ہم مندرجہ ذیل دو امور کو خاص طور پر اہم سمجھتے ہیں۔

دنیوی زندگی کی اہمیت اور قبائلیت

اس باب میں ہم پہلی خصوصیت سے بحث کریں گے۔ دوسری خصوصیت پر اگلے ابواب میں بات ہو گی۔

جن لوگوں نے عرب ثقافت کی خصوصیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ بدوی تصور کائنات میں حقیقت پسندی شدت سے پائی جاتی ہے بلکہ یہ اس کا خاصہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس خصوصیت کا تعلق اس سرزمین کی آب و ہوا سے ہے۔ حقیقتاً کچھ ایسی ہی بات ہے کہ اس تصور کے ساتھ ہی ہمارے ذہنوں میں فوری طور پر صحراؤں کی خشک ریت کی تصویر ابھرتی ہے۔ بہرکیف یہ حقیقت ہے کہ عرب سے وابستہ کسی چیز میں بھی تخیل کی پرواز نظر نہیں آتی۔ عرب کے حقیقت پسند ذہن میں موجود دنیا اپنی رنگا رنگی اور بوقلمونی کے باوجود صرف ایک دنیا ہے جو وجود رکھتی ہے۔ ایسے ذہن کے لیے ایک ابدی زندگی کا عقیدہ جو آنے والی ہے، ناقابل یقین ہے۔ اس دنیا سے باہر وہ کسی وجود کو نہیں مان سکتا۔

"قالوا ماھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا وما یھلکنا الا الدھر"

(الجاثیه: ٢٤)

وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے جس میں ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں تو زمانہ مار دیتا ہے۔

"قالوا ان هی الاحیاتنا الدنیا وما نحن بمبعوثین" (الانعام: ٢٩)

وہ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو صرف دنیا ہی کی ہے' ہم مرنے کے بعد پھر زندہ نہیں کیے جائیں گے۔

ان افکار کے مقابلے میں اسلام کی وحدانیت وجود کے قدیم جاہلی تصور سے لازمی طور پر متصادم نظر آتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہم وطنوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حشر اور آخری زندگی کا جو پیغام دیا وہ طنز اور تمسخر کا نشانہ بنا۔

"قالوا ء اذا متنا وکنا ترابًا وعظامًاء إنا لمبعوثون. لقد وعدنا نحن وآباؤنا هذا من قبل' ان هذا الا اساطیر الاولین" (المومنون: ٨٢-٨٣)

وہ کہتے ہیں کہ جب ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گے تو کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے۔ یہ وعدہ تو ہم سے اور ہم سے پہلے ہمارے باپ دادا سے بھی ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہ تو صرف اگلے لوگوں کی کہانیاں ہیں۔

"فقال الکفرون هذا شیئ عجیب ء اذا متناوکنا ترابا' ذلک رجع بعید" (ق: ٢-٣)

کفار کہنے لگے کہ یہ تو بڑی عجیب بات ہے' بھلا جب ہم مرگئے اور مٹی ہو گئے تو یہ لوٹنا عقل سے بعید ہے۔

"وقال الذین کفروا هل ندلکم علی رجل ینبئکم اذا مزقتم کل ممزق انکم لفی خلق جدید" (سبا: ٧)

اور کافر کہنے لگے کہ تمہیں ایسا آدمی نہ دکھائیں جو تمہیں یہ خبر دیتا ہے کہ
جب تم پارہ پارہ ہو جاؤ گے تو نئے سرے سے پیدا ہو گے۔

یاد رہے کہ زمانہ جاہلیت کے بدو بھی لفظ خلود (لمبی زندگی)[1] سے واقف تھے اور اس کا استعمال بھی کرتے تھے۔ لیکن ان کے بے حد حقیقت پسند ذہن میں موجودہ زندگی سے باہر خلود کا تصور موجود نہیں تھا۔ دوسرے الفاظ میں ان کے ہاں خلود کا مطلب اسی دنیا کی لمبی زندگی تھی۔

قبل از اسلام شاعری میں جس ابدیت کا بہت زیادہ ذکر ملتا ہے اور جو یقیناً طلوع اسلام سے قبل زمانہ جاہلیت کے عربوں کا سب سے اہم موضوع نظر آتا ہے۔ دراصل اس سے مراد اسی زمین پر ابدی زندگی ہے۔ اس زمانے کے ادب پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات بہت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ لوگ یہ جانتے تھے کہ دنیوی زندگی میں کتنے بھی خزانے جمع کر لیے جائیں اور کتنے بھی اچھے کام کر لیے جائیں وہ بیکار رہیں جب تک اس دنیوی زندگی کو کسی طرح سے لافانی نہ بنا لیا جائے۔ اس طرح کا لافانیت کا اصول یا مخلد ان کی تلاش اور جستجو کا محور رہتا تھا۔ تاہم یہ تلاش عبث تھی۔ قرآن کریم شدید طنزیہ اسلوب میں اس طرز فکر کو یوں بیان کرتا ہے:

"ویل لکل ھمزہ لمزہ الذی جمع مالا وعددہ یحسب ان مالہ

(۱) اس لمبی زندگی کی لمبائی اضافی چیز تھی۔ ہر شخص اس سے الگ مفہوم مراد لیتا تھا۔ مثلاً جاہلی شاعر عبید بن الابرص کے مندرجہ ذیل شعر میں خلد دو مرتبہ آگے پیچھے استعمال ہوا ہے لیکن پہلی مرتبہ اس سے مراد "دوسروں کے مقابلے میں زیادہ عمر پانا ہے یعنی جب دوسرے مرجائیں گے تب بھی زندہ رہنا" جبکہ دوسری مرتبہ ہمیشہ کی زندگی مراد ہے۔

فخلدت بعدھم ولست بخالد
فالدھر ذو غیر وذو الوان

ترجمہ: میں ان کے بعد بھی زندہ ہوں لیکن میں لافانی نہیں کیونکہ وقت بدلتا رہتا ہے اور اس کے کئی رنگ ہیں۔

اخلدہ" (الھمزہ: ۱-۳)

ہر طعن آمیز اشارے کرنے والے کے لیے خرابی ہے، جو مال جمع کرتا ہے اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے اور اسے یہ خیال ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ کی زندگی دے گا۔

عرب شاعر الاعشیٰ کہتا ہے:

کبھی بھی یہ نہ سوچو کہ دولت اپنے مالک کو لافانی بنا دیتی ہے۔ (۱)

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جاہلی ادب میں اس خیال کو کہ دولت اس دنیا کی سب سے اہم چیز ہے اور یہ کہ دولت انسان کو لافانی بناتی ہے۔ زیادہ تر خواتین خصوصاً بیویوں کی زبانی کہلوایا گیا ہے کہ جبکہ مرد اسے بیہودہ اور احمقانہ خیال کرتے ہوئے طنز کا نشانہ بناتے ہیں یا قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں کیونکہ یہ اخلاقی اصول "کرم" (فیاضی) کے خلاف ہے۔ مشہور شاعر المخبل (السعدی) کی بیوی خاوند کی فضول خرچی کی عادت پر تنقید کرتے ہوئے کہتی ہے:

ان الثراء هو الخلود وإ
ن المرء كرب يومه العدم (۲)

یقیناً دولت ہی خلود کا نام ہے۔ آدمی کے پاس دولت نہ ہو تو وہ اس کا آخری وقت ہوتا ہے یعنی موت۔

شاعر اس کا جواب یوں دیتا ہے:

---

(۱) مصنف نے شعر کا حوالہ نہیں دیا، ہمیں اس مفہوم میں اعشیٰ کا صرف مندرجہ ذیل شعر مل سکا ہے:

الم ترى الحضر اذ اهله
مبغمى وهل خالد من نعم

ترجمہ: کیا تو نے حضر کے لوگوں کو نہیں دیکھا کہ نعمتوں میں زندگی گزارتے تھے لیکن کیا دولت سے بھی کوئی لافانی ہوتا ہے۔

(دیوان الاعشیٰ الکبیر، تحقیق ڈاکٹر محمد حسین، قاہرہ: مکتبہ الآداب ۱۹۵۰ء، ص ۴۳) مترجم

(۲) دیوان المفضلیات، تحقیق کارلوس لائل، بیروت، مطبعہ آباء الیسوعیین، ۱۹۲۸ء، ص ۲۲۳

انی وجدک ماتخلدنی
مائه یطیر عفاوھا ادم[1]

میں تمہاری قسمت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایک سو فربہ اونٹ بھی جن کے بال ہوا میں اڑ گئے ہوں مجھے لافانی نہیں بنا سکتے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس دنیا میں ابدیت حاصل کرنے کے قطعی ناممکن ہونے کا تلخ احساس ایک ایسا تاریک انجام تھا جہاں جاہلیت کی فکری راہیں آکر ختم ہو جاتی تھیں اور یہیں سے اسلام نے اپنے عروج کا راستہ اختیار کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جاہلیت دونوں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ انسانی زندگی ناکامی سے دوچار ہے۔ قرآن کریم ور جاہلی شاعری دونوں میں زندگی کے عبث اور بے ثبات ہونے کا احساس پایا جاتا ہے۔ قرآن ریم کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ یہ بات کس طرح بار بار دہرائی گئی ہے۔

"انما الحیوہ الدنیا لعب و لھو" (محمد: ٣٦)

بے شک دنیوی زندگی تو محض کھیل تماشا ہے۔

"اعلموا انما الحیوہ الدنیا لعب و لھو وزینه وتفاخر بینکم وتکاثر فی الاموال والاولاد کمثل غیث اعجب الکفار نباته ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکون حطاما وفی الاخرہ عذاب شدید و مغفرہ من الله ورضوان وما الحیوہ الدنیا الا متاع الغرور" (الحدید: ٢٠)

جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل اور تماشا' زینت اور تمہارے آپس میں فخر اور مال و اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ طلب ہے' جیسے کہ بارش کہ کسانوں کو کھیتی بھلی لگتی ہے پھر وہ خوب زور پر آتی ہے پھر اسے دیکھو تو وہ

(۱) دیوان المفضلیات' تحقیق کارلوس لائین' بیروت مطبعہ آباء الیسوعین' ۱۹۲۸ء' ص ۲۲۳

زرد پڑ جاتی ہے، پھر چورا چور ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں عذاب شدید اور
اللہ کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دنیا کی زندگی تو متاع فریب
ہے۔

بظاہر دنیوی زندگی کا یہ قنوطی تصور اس تصور سے قطعاً مختلف نہیں جو شاعروں کے ہاں پایا جاتا تھا۔ قنوطیت کا یہ تاریک سایہ پوری جاہلی شاعری پر چھایا ہوا ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاہلی ادب میں یہ بنیادی اور فطری رجحان ہے۔ قبل از اسلام تمام ممتاز شاعروں کے ہاں انسانی زندگی میں اس خلاء پر مایوسی کی تلخ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر عبید بن الابرص کہتا ہے:

تذكرت اهلى الصالحين بملحوب
فقلبى عليهم هالك جد مغلوب

مجھے ملحوب میں موجود اپنے لوگ یاد آئے' میرا دل ان کے لیے پھٹا پڑتا تھا' غم سے معمور۔

تذكرتهم ما ان تجف مدامعى
كان جدول يسقى مزارع مخروب

وہ مجھے یاد آئے تو میرے آنسو اس تیزی سے بہنے لگے جیسے کسی ویران اور برباد کھیت میں پانی کا نالہ رواں ہو گیا ہو۔

وبيت يفوح المسك من حجراته
تسديته من بين سر و مخطوب

میں کئی خیموں میں جن کے کمروں سے مشک کی خوشبو آتی تھی' ایسی حالت میں گیا ہوں جو خفیہ اور خطبہ (منگنی کا پیغام) کے بین بین تھی۔

ومسمعه قد اضحل الشرب صوتها
تاوى الى اوتار اجوف محنوب

کئی گانے والیاں ہوتی تھیں جن کی آواز شراب کی وجہ سے بھاری ہو جاتی تھی۔
وہ کھو کھلے بربط کے تاروں پر گایا کرتی تھیں۔

شهدت بفتيان كرام عليهم
حباء لمن ينتابهم غير محجوب

میں ایسے ساتھیوں کے ساتھ جاتا تھا جو سب عالی نسب تھے' وہ ایسے لوگ تھے کہ کوئی بھی انہیں مدد کو بلائے تو وہ بے دریغ ہر ایک کی مدد کو اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔

فاصبح منى كل ذلك قد مضى
فاى فتى فى الناس ليس بمكذوب

اب یہ سب گذری ہوئی باتیں ہیں لوگوں میں کون ایسا ہے جسے جھٹلایا نہ گیا ہو۔

ترى المرء يصبو للحياه وطولها
وفى طول عيش المرء ابرح تعذيب[1]

تو نے لوگوں کو زندگی سے پیار اور اس کی طوالت کی خواہش کرتے دیکھا ہو گا
لیکن لمبی زندگی غم و اندوہ کے عذاب کے علاوہ کچھ نہیں۔

دیوان کی پہلی نظم میں اپنے عہد جوانی کی یادوں کے علاقے میں پھیلی ہوئی یاسیت کی ایک بھرپور تصویر کھینچنے کے بعد یہی شاعر دنیا کی بے ثباتی پر اخلاقی تبصرہ کرتا ہے:

وكل ذى نعمه مخلوس
وكل ذى امل مكذوب

ہر صاحب نعمت سے نعمت چھین لی جاتی ہے اور ہر امید جھٹلا دی جاتی ہے۔

وكل ذى ابل موروث
وكل ذى سلب مسلوب

(۱) دیوان عبید الابرص الاسدی' تحقیق چارلس لیال' لیڈن' برل' ۱۹۱۳ء' ص ۳۲-۳۳

ہر صاحب مال کا مال وارثوں میں بٹ جاتا ہے اور جو بھی غنیمت حاصل کرتا ہے وہ اپنی باری پر خود غنیمت بن جاتا ہے۔

والمرء ما عاش فی تکذیب
طول الحیاہ لہ تعذیب[1]

جتنی دیر ایک شخص زندہ رہتا ہے' وہ اپنے آپ کو دھوکہ ہی دیتا ہے' عمر کی درازی عذاب میں اضافے کے علاوہ کچھ نہیں۔

لہٰذا جہاں تک زندگی کی بے مائگی' خالی اور عارضی ہونے کا تصور ہے' اسلام اور جاہلیت دونوں مشترکہ طور پر ایک ہی بات کہہ رہے ہیں لیکن دونوں بالکل مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں۔ کیونکہ جاہلیت موجودہ دنیا سے آگے نہ کسی زندگی کو مانتی تھی اور نہ ماننا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس اسلام ایک دین ہے جس کی بنیاد آخرت کے روشن عقیدے پر ہے۔ جب ہم یہ بات تسلیم کر لیں اور آنے والی زندگی پر ایمان ہے تو اس دنیا میں ابدیت حاصل کرنے میں ناکامی کسی مایوسی کی طرف نہیں لے جاسکتی۔ چنانچہ ایک جاہل آدمی کے لیے ابدیت جتنا سنگین اور لاینحل مسئلہ تھا' اسلام نے اسے اتنا ہی آسانی سے ایک ایسے عالم کی طرف منتقل کر دیا جو موجودہ وجود کے آفاق سے باہر ہے۔

"بل توثرون الحیوہ الدنیا والآخرہ خیر و ابقی" (الاعلی : ۱۶-۱۷)

مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

"تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الآخرہ" (الانفال : ٦٧)

تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔

---

(۱) دیوان عبید الابرص الاسدی' تحقیق چارلس لیال' لیڈن' برل' ۱۹۱۳ء' ص ۸-۹

"المال والبنون زينه الحيوه الدنيا والبقيت الصلحت خير عند ربک ثوابا وخير املا" (الکہف: ٤٦)

مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی زینت ہیں اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں' وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔

اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ یہ دنیا عارضی اور فضول ہے' اس لیے اس کا اعتبار نہیں۔ اگر آدمی لافانی بننا چاہتا ہے اور ہمیشہ کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے اپنی زندگی میں بنیادی اصول کے طور پر آخرت کو شامل کرنا ہو گا۔ جاہلیت کی تعلیم تھی کہ یہ دنیا فضول ہے اس سے باہر بھی کچھ نہیں۔ چنانچہ اس عارضی زندگی کو بھرپور طریقے سے جینا چاہیے۔ جاہلی ذہن کے لیے حصول مسرت واحد علاج دکھائی دیتا تھا۔

طرفہ کے مشہور معلقہ کے مندرجہ ذیل دو اشعار سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا میں ابدیت کے ناممکن ہونے کا تعلق عیش اور مسرت کے اصول سے کس قدر اہم ہے۔

الا ایھذا اللائمی احضر الوغی
وان اشھد اللذات ھل انت مخلدی

اے مجھے جنگ میں موجود رہنے اور لذات میں مشغول رہنے پر ملامت کرنے والے سن! کیا تو مجھے حیات جاودانی دے سکتا ہے۔

فان کنت لاتستطیع دفع منیتی
فدعنی ابادرھا بما ملکت یدی

اگر تو ایسا نہیں کر سکتا اور مجھے موت سے نہیں بچا سکتا تو میرا پیچھا چھوڑ تا کہ میرے پاس جو مال ہے' اسے موت سے پہلے خرچ کر لوں۔[1]

(۱) المعلقات السبع' ترجمہ و تشریح مولانا قاضی سجاد حسین' کراچی' نور محمد کارخانہ تجارت' پ۔ت۔ن' ص ۲۸' معلقہ طرفہ' تحقیق: آرنلڈ (لائزنگ ۱۸۵۰ء) ص ۵۶-۵۷

جاہلی شاعری دنیوی لذات کے قصائد سے بھری پڑی ہے۔ اسی معلقہ میں آگے چل کر یہی شاعر کہتا ہے:

فان تبغنی فی حلقه القوم تلقنی
وان تقتنصی فی الحوانیت تصطد

اگر تو مجھے تلاش کرے گا تو اپنی قوم کی مجالس میں ملوں گا۔ اگر تو میرے پیچھے شراب کی دکانوں میں آئے گا تو وہاں مجھے پکڑ سکے گا۔

ندامای بیض کالنجوم وقینه
تروح علینا بین برد و مجسد

میرے شراب کے ساتھی ستاروں کی طرح روشن ہیں اور ایک مغنیہ سرشام دھاریدار چادر اور زعفرانی کپڑوں میں ہمارے پاس آتی ہے۔

رحیب قطاب الحبیب منها رفقیه
بحبس الندامی بضه المتجرد

اس مغنیہ کے گریبان کا چاک کھلا ہے۔ جب میرے دوستوں کی انگلیاں اسے چھیڑتی ہیں تو وہ بہت نرم خو ہے۔ اس کا عریاں بدن کا حصہ بہت نرم و نازک ہے۔

اذا نحن قلنا اسمعینا انبرت لنا
علی رسلها مطروقه لم تشدد

جب ہم اسے کہتے ہیں کچھ سناؤ تو وہ نہایت نرم آواز سے نیچی نگاہ کیے ہوئے کسی سختی کے بغیر ہمارے سامنے گاتی ہے۔[1]

ان اشعار میں شراب نوشی کی عادت کا ذکر ہے جو جاہلی لوگوں کے نزدیک مسرت کا

(۱) المعلقات السبع، ترجمہ و تشریح مولانا قاضی سجاد حسین، کراچی، نور محمد کارخانہ تجارت، ت۔ن، ص ۲۸، معلقہ طرفہ، آرنلڈ (لائزنگ ۱۸۵۰ء) ص ۲۶-۲۷

سب سے اعلیٰ ذریعہ تھا۔ یہ بات کہ زندگی روز بروز کے اصول پر بتائی جائے اور اس کا جاہلی طرز کی اخلاقیات پر عملی طور پر کتنا اثر تھا' ان اشعار سے بہتر کہیں بیان نہیں ہوئی۔ ان لوگوں کی زندگی میں شراب قسمت کا سب سے بڑا تحفہ تھا۔ زمانہ جاہلیت کے لوگ اکثر شراب کے رسیا تھے۔ وہ عادتاً بھی شراب پیتے تھے اور اسے فخر و مباہات کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے۔ فیاض طبیعت کی سب سے واضح شہادت شراب کی دعوت سمجھی جاتی تھی۔ یاد رہے کہ زمانہ جاہلیت کے عربوں میں ذاتی خوبیوں میں فیاضی سب سے بڑی خوبی تھی۔

کریم یروی نفسه فی حیاته
ستعلم ان متنا غدا اینا الصدی[1]

میں ایسا شریف آدمی ہوں جو اپنی زندگی کو شراب سے سیراب کرتا ہے۔ جب ہم مرگئے تو تجھے معلوم ہو گا ہم میں سے کون پیاسا ہے۔

عبید بن الابرص کہتا ہے:

بماء سهاب فی اباریق فضه
لها ثمن فی البائعین ربیح[2]

چاندی کے برتنوں میں بادلوں کا پانی تھا۔ قیمت اتنی کہ تاجروں کی چاندی تھی۔

یہی شاعر ایک اور جگہ کہتا ہے:

تغلی السباء بکل عا
تقه شمول ما صحونا

ہم ہر پرانی شراب کی اونچی بولی لگاتے تھے جب تک ہوش میں ہوتے تھے۔

(۱) معلقات السبع' معلقہ طرفہ' محولہ بالا' ص ۲۹

(۲) دیوان عبید بن الابرص' محولہ بالا' ص ۲۹

ونهين فى لذاتها
عظم التلاد اذا انتشنيا

اور جب ہم نشے میں ہوتے تو اس کی لذت میں اپنی موروثی دولت کا کوئی حساب نہیں رکھتے تھے۔(1)

ایک اور مشہور جاہلی شاعر لبید بن ربیعہ جس نے طویل عمر پائی اور بہت آخر میں قبول اسلام کا موقع ملا' اپنی جوانی کے زمانے میں شراب کی خوشی کے گیت گایا کرتا تھا۔ اس کے معلقہ میں سے مندرجہ ذیل اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں' جن میں وہ اپنی محبوبہ نوار کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے:

بل انت لاتدرين كم من ليله
طلق لذيذ لهوها و ندامها

بلکہ تو جانتی ہی نہیں کہ کتنی ہی راتیں ایسی گزریں جو کھیل کود اور شراب نوشی سے پر لطف تھیں۔

قدبت سامرها وغايه تاجر
وافيت اذ رفعت وعن مدامها

ان راتوں میں میں قصے سناتا رہا' شراب کے تاجروں نے شراب کی قیمت بڑھانے کے لیے جھنڈے بلند کیے مگر میں ان کی باتیں سنتا رہا۔

اغلى السباء بكل اوكن عاتق
او جونه قدمت وفض ختامها

میں ہر پرانے شراب کے مشکیزے کو کھول کر یا سیاہ مٹکے کی مہر کو توڑ کر اس میں پیالہ ڈال کر شراب کی قیمت بڑھا دیتا تھا۔

(1) دیوان عبید بن الابرص' محولہ بالا' ص ۲۸

وصبوح صافیه وجذب کس نیه
ممبوتر تاتاله ابهامها

میں صبح ہی صبح شراب پینے میں کتنی لذت محسوس کرتا تھا' جب کہ ساتھ ایک مغنیہ ہو جو اپنی نرم و نازک انگلیوں سے بربط بجا رہی ہو۔

بادرت حاجتها الدجاج بسحره
لاعل منها حین هب نیامها

میں صبح مرغ کے جاگنے سے پہلے اپنی حاجت پوری کر لیتا تھا تا کہ جب سونے والے بیدار ہوں تو دوبارہ پی سکوں۔[1]

طرفہ جس کا ہم بار بار ذکر کر چکے ہیں' وہ بھی اسی قسم کا آدمی تھا۔ وہ اپنی نظم میں اپنی بے وقعت قسمت کا ذکر کرتا ہے جس نے زندگی کی تمام مسرتیں چھین لی ہیں۔

وما زال تشرابی الخمور ولذتی
وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

میں اسی طرح شراب پیتا رہا' مزے اڑاتا رہا اور اپنی ذاتی موروثی دولت بیچتا اور خرچ کرتا رہا۔

الی ان تحامتنی العشیره کلها
وافردت افراد البعیر المعید[2]

حالت یہ ہو گئی کہ تمام خاندان نے مجھے چھوڑ دیا اور میں خارش زدہ اونٹ کی طرح اکیلا رہ گیا۔

ایک قدیم روایت کے مطابق مشہور جاہلی شاعر اعشیٰ اس عزم کے ساتھ روانہ ہوا کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں پہنچ کر اسلام قبول کر لے۔ راستے میں ایک جاہلی دوست

(۱) المعلقات السبع' محولہ بالا' ص ۵۵

(۲) المعلقات السبع' محولہ بالا' ص ۲۷

ملا جس نے سفر کی وجہ دریافت کی۔ شاعر نے بتایا کہ وہ قبول اسلام کے لیے پیغمبر کی طرف جا رہا ہے۔ دوست نے بتایا کہ اسلام زنا کو منع کرتا ہے' اس نے کہا مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ ہوتے ہوتے جب اس کے دوست نے کہا' کیا تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ شراب بھی منع کرتے ہیں تو اس نے کہا یہ میں آسانی سے چھوڑ نہیں سکتا۔ اگر یہ بات ہے تو میں واپس جاتا ہوں' سال بھر خوب جی بھر کے شراب پیوں گا اور اگلے سال اسلام قبول کر لوں گا۔ وہ واپس گیا لیکن اسی سال اس کی وفات ہو گئی۔ چنانچہ وہ پیغمبر کی بارگاہ میں حاضری نہ دے سکا۔[1]

یہ بعینہ اسی قسم کے بے فکرے لوگ تھے' جن میں حضرت محمد ﷺ نے مستقبل کی زندگی کے اور یوم حساب کے نئے عقیدے کا اعلان کیا۔ آپ نے محسوس کیا کہ ان کے اردگرد لھو و لعب' دنیاداری اور بے مقصدیت کے سوا کچھ نہ تھا۔

"وفرحوا بالحیوہ الدنیا وما الحیوہ الدنیا فی الاخرہ الا متاع"
(الرعد: ٢٦)

یہ لوگ دنیوی زندگی پر خوش ہو رہے اور دنیا کی زندگی میں آخرت کے مقابلے میں بہت کم فائدہ ہے۔

"وما الحیوہ الدنیا الا لعب و لھو للدار الآخرہ خیر للذین یتقون افلا تعقلون" (الانعام: ٣٢)

اور دنیا کی زندگی تو ایک کھیل اور شغل ہے۔ اچھا گھر تو آخرت کا گھر ہے' ان کے لیے جو خدا سے ڈرتے ہیں' کیا تم سمجھ نہیں رہے۔

یہ بے خدا اور بے پرواہ قوم جس کے نزدیک دنیاوی زندگی مکمل فریب تھی' مذہب کو کھیل اور تماشے کا علاوہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ (٦:٦٩-٧٠' ٧:٤٩-٥١) قرآن کریم کے نقطۂ نظر سے جاہلیت کی روحانی کیفیت کے رویے کی نمائندگی عیش و عشرت اور دین کے سنجیدہ معاملات

(۱) ابن اسحاق: سیرہ' جلد اول' ص ۲۵۲

میں مکمل بے پروائی سے ہوتی تھی۔ یہ بے فکرے لوگ جو ہنستے ٹھٹھے اڑاتے اور مذاق کرتے تھے۔ انہیں پیغمبر خداﷺ نے آنے والے دوزخ کے عذاب کی خبر سنائی۔ انھوں نے کہا کہ یوم حساب بے حد قریب ہے' اس دن بے خدا لوگوں کو اس دنیا میں اپنی بے مقصد زندگی کا حساب چکانا ہو گا۔

"ویوم یعرض الذین کفروا علی النار اذھبتم طیبتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا فالیوم تجزون عذاب الھون بما کنتم تستکبرون فی الارض لغیر الحق وبما کنتم تفسقون" (الاحقاف: ۲۰)

اور جس دن کافر دوزخ کے سامنے کیے جائیں گے کہ تم اپنی دنیا کی زندگی میں لذتیں حاصل کر چکے اور اس سے متمتع ہو چکے' آج تم کو ذلت کا عذاب ہے' اس بات کی سزا کہ تم زمین پر ناحق غرور کیا کرتے تھے اور اس بات کی کہ تم بد کرداری کرتے تھے۔

"انه کان فی اھله مسرورا انه ظن ان لن یحور بلی ان ربه کان به بصیرا" (الانشقاق: ۱۳-۱٤)

یہ شخص اپنے اہل و عیال میں خوش تھا اور خیال کرتا تھا کہ واپس نہیں جائے گا' ہاں اس کا پروردگار اس کو دیکھ رہا تھا۔

ان حالات کے پیش نظر قرآنی نقطۂ نظر سے اس دنیا میں انسان کا بنیادی رویہ مایوسی کی بنا پر عیش پرستی نہیں ہونا چاہیے جو کہ قبل از اسلام عربوں میں رواج پا گئی تھی بلکہ اس کے برعکس یوم قیامت کی آمد کے شدید احساس کی بنیاد پر سنجیدہ طرز زندگی ہونا چاہیے۔ خوف خدا یعنی یوم حساب کے مالک کے سامنے ڈر کا رویہ ایک مذہبی جذبات رکھنے والے انسان کے ہر عمل کا بنیادی مقصد ہونا چاہیے بلکہ یوں کہیے کہ یہی رویہ انسان کی زندگی کے رخ کو متعین کرتا

ہے۔ اس ضمن میں بنیادی لفظ تقویٰ ہے۔ انسان کے صحیح معنوں میں شریف ہونے کا ثبوت دنیوی زندگی میں نہیں ملتا۔ صحیح شریف آدمی وہ نہیں جو اپنی دولت کو بے مقصد اور بے اختیار خرچ کرتا ہے۔ شریف وہ شخص ہے جو اخلاقی سنجیدگی سے زندگی گزارتا ہے اور جسے قیامت کی ہولناکی کا ہمیشہ احساس رہتا ہے۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ قرآن کریم میں لفظ کریم کو تقویٰ یعنی خوف خدا کی عبارت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

"ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم" (الحجرات : ۱۳)

خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا سب سے زیادہ خوف خدا رکھنے والا ہے۔

ہم اس بات کی اہمیت کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ اسلام نے قدیم اخلاقی کائنات کو معنویاتی طور پر نئی قدریں عطا کر کے ایک انقلاب برپا کیا۔ زمانۂ جاہلیت میں کریم کا لفظ اعلیٰ ترین صفات کا حامل تھا۔ اس سے مراد وہ شخص تھا جو حسب و نسب اور فیاضی میں سب سے آگے ہو۔ تاہم اسلام سے پہلے کبھی اعلیٰ اور برتر کے تصور کو خوف خدا کے حوالے سے بیان نہیں کیا گیا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اس سیاق و سباق میں "خوف" کا مفہوم سزا کے ڈر سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ بہت سال پہلے تور آندرے نے "خوف خدا" کا بطور گہری اخلاقی دینی قدر مطالعہ کیا تھا،[1] جس کی رو سے خدا یوم حساب کا مالک ہے۔ اس کی بحث کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اس خوف سے مومن کے ذہن میں زندگی کے بارے میں انتہائی سنجیدگی کا شعور پیدا ہوتا ہے جو اسے اخلاقی متانت اور ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے۔ ہمیشہ ایسے عمل کرو جیسے تم اب بھی اس خدا کے سامنے کھڑے ہو جو تمہارے ہر عمل کو جانچتا ہے۔ اس سے پہلے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کا حساب لے۔ اپنے ابتدائی دور ہی میں اسلام نے انسانی رویے

(۱) تور آندرے: محمد' حیات و افکار (جرمن) گوٹنگن' ۱۹۳۲ء' باب سوم

کا یہ پہلا اور بنیادی اصول متعین کر دیا تھا۔[1] لیکن یہ ساری باتیں اس وقت تک ناممکن اور بے معنی ہوں گی جب تک آخرت کا عقیدہ موجود نہ ہو۔ خوف خدا کا اخلاقی اصول صرف اس وقت استوار ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد توحید کے ایسے عقیدے پر ہو جس میں خدا کو یوم حساب کا مالک مان لیا جائے۔

(۱) قرآن کے بعد کے دور میں اولین زہاد کے ہاں تقویٰ مرکزی نکتہ قرار پایا۔ اس رجحان کی نمایاں مثال حسن بصری ہیں۔ اس موضوع پر دیکھئے۔ ایچ۔ رٹر: "اسلامی مذہبیت کی تاریخ کا مطالعہ" در اسلام (جرمن) جلد ۲۱، (۱۹۳۳) صفحات ۱-۸۳